اگر چہ ایک زنگ آلود قفل کا..ایک بند دروازے اور کائی زدہ پتھر کا..اندھے کنویں کا اور ایک دھوپ میں بدن سے الگ ہوتے سنہری روئیں کا آپس میں کوئی ربط نہیں لیکن اس مسئلے کا حل اس بے ربطی میں پوشیدہ ہے۔

یہ ایک مردہ شاعرہ کی انگلیوں..مردہ انگلیوں سے لکھا گیا ایک بے ربط خط بھی تو ہو سکتا ہے۔

مردہ شاعرہ کو زندہ حالت میں اس نے بہت کم دیکھا تھا..

وہ ایک دوسرے کے وجود سے تو آگاہ تھے' لیکن ایک دوسرے کو جانتے نہ تھے..کبھی کسی محفل میں آمنا سامنا ہونے پر ماتھے تک جاتا ہوا ایک ہاتھ..کسی مشاعرے میں ایک ہلکی سی.. پہچان والی مسکراہٹ..کبھی کسی ناشر کی سیڑھیاں چڑھتے..اور وہ اترتی..آپ کیسی ہیں؟..اور آپ کیسے ہیں؟..کسی شادی میں کسی اور کی متلاشی نظروں میں اس کا چہرہ فوکس میں آجاتا تو وہ ٹھٹک جاتی..یہ لوگ آپ کے بھی عزیز ہیں؟..اور اس کے سوا اخباروں میں رنگین تصاویر..اور وہ تصویر کھنچوانے میں بے حد محتاط تھی..اس امر سے بخوبی آگاہ کے چہرے کے کون سے رخ کے ساتھ کیمرہ اچھا سلوک کرتا ہے اور کون سا موڈ اس کی شاعری کی نمائندگی کرتا ہے..ٹیلی ویژن پر انٹرویو اور میزبانی کے فرائض..ادبی جرائد میں کلام..بس اتنا ہی ربط تھا..جو سینکڑوں لوگوں کے درمیان ہوتا ہے...

ایک واقف کار جو اسے کالج کے زمانے میں جانتا تھا' اس کا کہنا تھا کہ بس اس کا چہرہ ہے اور اس کے نیچے وہ قدرے ناتواں اور میدانی ہے..لیکن جب اس کا چہرہ بنتا تھا احتیاط اور حس جمال کے ذوق کو بروئے کار لا کر میک اپ کے ساتھ..تو جب وہ چہرہ تیار ہوتا تھا' بنتا تھا تو ایسا چہرہ ہو جاتا تھا جو ہیلن آف ٹرائے کی مانند ایک ہزار بحری جہازوں کے بادبان کھول سکتا تھا..

وہ بے پناہ مقبولیت میں سانس لیتی تھی..اس کے شعر شکایتی خطوں میں Quote کیے جاتے تھے..اور تیروں کی طرح نشانے پر بیٹھتے تھے۔ بے وفائی..نارسائی.....راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے پر ایک ایسی اوس کی طرح گرتے تھے جو کسک تو کم کرتی تھی لیکن اس کی اذیت کا لطف برقرار رکھتی تھی..یہ نہیں کہ وہ صرف کچی عمر کے جذبوں کی شاعرہ تھی بلکہ پکی عمر والے بھی جب کبھی کسی

ناگہانی عشق کی آفت میں مبتلا ہوتے تھے تو وہ بھی اس کے شعروں کا سہارا لیتے تھے.. کیونکہ وہ ایک...شاعرہ...تھی..

اور تیروں کی طرح نشانے پر بیٹھنے والے اس کے شعروں میں ایک شعر ایسا تھا جو اس کے سینے میں نہ صرف آج تک پیوست تھا.. آج تک ایک پھانس کی مانند اٹکا ہوا اسے مجرم بناتا تھا کہ اس نے اپنے آخری خط میں مردہ شاعرہ کے اس شعر کا حوالہ دے کر اسے بے عزت کیا تھا.. کیونکہ وہ شعر اس کی بزدلی اور کم حوصلگی کے عین مطابق تھا.. اس شعر کے حوالے کے بعد ہی اس نے مردہ شاعرہ کے لیے ایک شدید ناپسندیدگی کا رویہ اختیار کر لیا.. وہ اگر یہ شعر نہ لکھتی تو وہ ابھی تک باعزت ہوتا.. محفلوں میں وہ نظریں چرا لیتا.. سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ نظریں نیچی کر لیتا اور جب وہ کہتی کہ...جی آپ کیسے ہیں تو وہ مصنوعی ہڑبڑاہٹ سے بوکھلا کر کہتا.. اچھا آپ ہیں میں نے دیکھا ہی نہیں.. یہاں تک کہ اس کی تصویر بھی اسے مجرم بنا دیتی.. ظاہر ہے مردہ شاعرہ کو قطعی علم نہ تھا کہ یہ شخص اتنا روکھا کیوں ہو گیا ہے.. اور نہ اسے پروا تھی.. سینکڑوں اتفاقی ملاقاتیوں میں سے ایک کا رویہ اگر بدل جائے تو کیسے علم ہو سکتا ہے..

چنانچہ مردہ شاعرہ کو زندہ حالت میں اس نے بہت کم دیکھا تھا..

وہ اکثر بہت ڈھیلے ڈھالے گاؤن نما لباس زیب تن کرتی جن سے نشیب و فراز کی کم مائیگی کا اندازہ نہ ہو اور وہ بہت شاہانہ دکھائی دیتی.. ہر نظر.. ہر کیمرے کا فوکس اس کے چہرے پر ہوتا جوان ہزاروں بحری جہازوں میں سے چند ایک کے بادبان اس محفل میں کھول دیتا..

حسب معمول اس سویر بھی.. تقریباً ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ وہ اس ایک چوک میں سے گزر کر شاہراہ کی جانب مڑا.. جس چوک میں سے گزر کر وہ ہمیشہ اسی وقت شاہراہ کی جانب مڑتا تھا.. تو اس نے ایک ہجوم دیکھا..

وہ چوک میں سے گزر کر شاہراہ کی جانب بائیں ہاتھ پر مڑنے کو تھا جب اس نے ایک ہجوم دیکھا..

یہ کوئی سیاسی ہجوم نہ تھا کہ خاموش تھا.. یوں بھی اس مقام پر ہجوم کو جمع ہونے کا موقع پولیس نہیں دیتی تھی کہ عین سامنے شاہراہ کے آخر میں صدارتی محل تھا.. صدر صاحب.. ایک جمہوریہ کے صدر صاحب.. جیسے تیسے بھی ہوں.. بے شک پتلی تماشا ہوں.. ایک قصر صدارت کے آس پاس

دو چار کلو میٹر کے دائرے میں ظاہر ہے ایسا ہجوم برداشت نہیں کر سکتے جو سیاسی ہو..

ہجوم خاموش تھا اور اس کے درمیان میں کوئی ایسی شے تھی جسے ''وہ'' پُرتشویش نگاہوں سے تک رہا تھا۔

''یہاں کیا ہوا ہے منظور..'' اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا جس نے کار کی رفتار کم کر دی تھی..

''کیا پتہ صاحب..آپ کہو تو گاڑی روکتا ہوں اور پتہ کرتا ہوں..''

''نہیں..تم چلے چلو..''

''کوئی حادثہ ہوا لگتا ہے صاحب..ایک کار کچھ تباہ ہو گیا لگتا ہے صاحب..''

حادثے تو ہوتے رہتے تھے..

تو کسی ایک حادثے کے لیے اپنا پینڈا کھوٹا کرنا..چہ معنی..

''تم چلے چلو..''

کام سے واپسی پر..اس نے اپنے میر پوری ملازم کی موٹی بیوی کے ہاتھوں کا بنایا ہوا بدمزہ کھانا کھایا اور کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا..کمرے میں مکمل تاریکی تھی اور یہ معلوم نہ پڑتا تھا کہ باہر ابھی دوپہر ہے..دھوپ ہے..جب فون کی گھنٹی اس کی تھکاوٹ اور بے سکونی کو کچوکے دیتی بجنے لگی..چُپ نہ ہوئی..

دوسری جانب اس کا ایک متشرع اور عزیز دوست تھا..اور شاعر بھی تھا..

''تمہیں پتہ ہے شاعرہ مر گئی ہے؟''

''کون سی شاعرہ؟''

''شہر میں ایک ہی تو شاعرہ تھی..وہی مر گئی ہے۔''

''کیسے؟'' اس کا سوال اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا..

''آج صبح..وہ دفتر کے راستے میں تھی..سامنے سے ایک اور کار سیدھی اس کی ونڈ سکرین پر آ گئی..فلاں چوک سے مڑتے ہوئے..ڈرائیور بھی مر گیا ہے..وہ پچھلی نشست پر تھی۔''

ایک سینئر شاعرہ جو حیرت انگیز طور پر خوشی اور غمی کے ہر موقع پر موجود ہو جاتی تھی..تسلی بخش فقرے ایک تسلسل سے کہتی چلی جاتی تھی۔اس نے بتایا ''اسے بمشکل اکٹھا کیا گیا...اس کا چہرہ..جو ایک ہزار بحری جہازوں کے بادبان کھول دینے پر قادر تھا..حادثے کی شدت سے پھٹ گیا

تھا.. اسے یکجا کرنے کے لیے سیا گیا تھا. عوجیب دِنے کھوسولی دھاکے سے چھو سے بنایا گیا تھا..''

''تمہیں اطلاع کرنی تھی کہ جنازہ پچھلے پہر ہے'' مشرع شاعر نے اطلاع کی اور فون بند کر دیا..

اسے شاعرہ کی موت کا دکھ نہیں ہوا تھا.. ہاں ایک ایسی موت کا دکھ ہوا تھا جو یونہی بے وقت سرسری طور پر درمیانی عمر میں پہنچتے ہی آ گئی تھی جب کہ اصولی طور پر اسے بہت بعد میں آنا چاہیے تھا..

وہ ان لوگوں کے جنازوں میں بھی چلا جاتا تھا' جنہوں نے زندگی بھر اسے زچ کیا تھا.. اس کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے.. اس لیے نہیں کہ وہ ایک طمانیت محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے پہلے رخصت ہو گئے بلکہ اس لیے کہ موت تمام تر رنج اور شکایتیں تلف کر دیتی ہے.. اگر نہیں تلف کرتی تو حیوانوں کے لیے نہیں کرتی انسانوں کے لیے کر دیتی ہے..

تو شاعرہ کے جنازے پر اسے بہرصورت پہنچنا تھا کہ اگر وہ دوست نہ تھی تو دشمن بھی ہرگز نہ تھی..

بہت کم لوگ تھے..

اتنے کم کہ جنازگاہ میں پہنچ کر اسے اس کی موت کا زیادہ دکھ ہوا..

مقبولیت آپ کے جنازے کو بڑا نہیں کر سکتی..

لوگ آپ کے لفظ کے شیدائی ہوتے ہیں آپ کے نہیں..

آپ کی بجائے اگر آپ کے لفظ مر جائیں تو ان کا جنازہ بہت بڑا ہوگا..

البتہ ایسا جنازہ اخباروں اور ٹیلی ویژن پر آہستہ آہستہ بہت بڑا ہو جاتا ہے جب سوگوار ہم عصر نہایت دکھی شکلیں بنائے بھرائی ہوئی آواز میں شاعرہ کے ساتھ دیرینہ اور نہایت قریبی تعلقات کے دعوے کرتے ان آنسوؤں کو پونچھتے ہیں جو وہاں نہیں ہوتے اور پھر پوچھا کرتے ہیں کہ یار تم نے شاعرہ کی موت پر میرا کالم پڑھا تھا.. میرا بیان دیکھا تھا..

لیکن اس کے جنازے پر وہ نہیں پہنچ پاتے..

چنانچہ اتنے کم لوگ دیکھ کر اسے اس کی موت کا مزید دکھ ہوا.. وہ اتنے کم تھے کہ دور سے یہی لگتا تھا کہ چند لوگ قبرستان کی تنہائی میں کوئی خفیہ بات کرنے آئے ہیں..

نماز کے بعد اس کی سیاہ پوش چارپائی اٹھائے ہوئے جب وہ اس کے سرکاری محکمے کی

تن دہی کی بدولت پہلے سے کھودی گئی قبر کی جانب جاتے تھے تو کندھا دینے کی باری بار بار آ جاتی تھی کہ بس اتنے ہی لوگ تھے..

چار پائی قبر میں سے کھودی جانے والی مٹی کے ڈھیر پر رکھی گئی تو اس کے تینوں پائے تو مٹی پر جم گئے لیکن چوتھا ڈھلوان پر ٹیڑھا ہو کر پڑا.. چار پائی کا توازن بگڑا تو سیاہ چادر تلے کفن میں لپٹی لاش لڑھک کر اس کی ریلنگ کے ساتھ آ لگی.. اس ریلنگ کا یہی مقصد تھا کہ مردہ بدن ادھر ادھر ڈھلک کر چار پائی سے گر نہ جائے..

قبر میں اتارنے سے پیشتر اعلان کیا گیا کہ جنازہ زنانہ ہے.. اسے صرف حقیقی رشتے دار ہی اٹھا سکتے ہیں.. نامحرم ہاتھ نہیں لگا سکتے..

قریبی رشتے دار اس لمحے صرف ایک ہی تھا جو ایئر پورٹ سے براہ راست ابھی ابھی قبرستان پہنچا تھا... کراچی سے آیا تھا اور بوکھلایا ہوا تھا.. اس نے کچھ توقف کیا اور پھر اس کے ذہن میں آیا کہ اسی کو قبر میں اتر کر اپنی عزیزہ کو وصول کرنا ہے.. ظاہر ہے اسے قبروں میں اترنے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ اس لیے وہ جھجکتا ہوا.. ایک دو ہاتھوں کو تھامتا نیچے اترا..

اب کسی نہ کسی کو اسے.. شاعرہ کو چار پائی سے اٹھا کر.. یوں اٹھا کر کہ سفید کفن میں لپٹی.. سلی سلائی مردہ شاعرہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے مضبوطی سے یوں جکڑنا تھا کہ اس کا بقیہ بدن بھی ڈھلک نہ جائے.. نیچے بانہیں پھیلائے قریبی عزیز کے ہاتھوں میں دینا تھا.. کسی نہ کسی کو..

سبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے..

یہاں اگر شاعرہ کی کوئی دوست ہوتی.. کوئی عزیزہ' کوئی چاہنے والی ہوتی تو یہ کام کتنا آسان ہو جاتا لیکن اس کی اجازت نہ تھی..

ایک عورت مرنے کے بعد بھی کتنی لاچار اور تنہا ہوتی ہے کہ اسے اس کی کوئی ہم جنس قبر میں بھی اتار نہیں سکتی کہ اس کی اجازت نہ تھی..

ایک ہم عصر معتمک شاعر جو اس کی از حد تعظیم کرتے تھے' آگے بڑھے اور جھک کر مردہ شاعرہ کے بدن کو.. کچھ اور لوگوں.. نامحرم لوگوں کی مدد سے اٹھایا اور اسے قبر کے اندر کھڑے قریبی عزیز تک پہنچانے کے لیے جھکنے کو تھے کہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا. لرزنے لگے.. انہیں دل کا عارضہ تھا اور اس لمحے یکدم دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ لاش ان کے ہاتھوں میں سے گرنے والی تھی جب انہوں نے اسے اپنے سامنے مٹی کے ڈھیر پر کھڑے دیکھا اور کہا ''یار.. تم آ جاؤ پلیز..

مجھ سے یہ نہیں سنبھلتی..''

وہ جو ایک تماشائی کی طرح اس ڈھیر پر کھڑا پردہ گرنے کا منتظر تھا..معتک شاعر کی پکار پر قدرے بوکھلا گیا اور آگے ہو کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔اس کے ڈھلکے ہوئے کفن میں لپٹے بدن کو سنبھال لیا..

اگرچہ ہر لاش اپنی زندگی کی نسبت موت میں زیادہ بھاری ہو جاتی ہے لیکن مردہ شاعرہ کا بدن مور کے رنگین پَر ایسا ہلکا تھا..

مٹی کے ڈھیر پر کھڑے لوگ اسے مسلسل ہدایات دے رہے تھے..کمر پر گرفت مضبوط رکھیں..سر کے ڈھلکنے کا خیال رکھیں..

اور تب..جب وہ اسے قبر میں اتار رہا تھا..قریبی عزیز کے بڑھے ہوئے ہاتھوں تک اتار رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ کفن کے اندر مردہ شاعرہ کا جو ہاتھ تھا..مردہ ہاتھ تھا وہ اس کے فی الحال زندہ ہاتھ کی گرفت میں آ گیا۔یوں آیا کہ اس کی ایک ایک ڈھلکی ہوئی مردہ انگلی کے درمیان جیسے کفن کا کپڑا نہ ہوا..اور وہ اسے زندگی میں تھامے ہوئے ہو..یہ ایک ناقابل بیان سنسنی تھی اوہ وہ سناٹے میں آ گیا..اس کا ہاتھ ایک سوئے ہوئے بچے کی طرح بے جان اور بے حس تھا..

اور اس لمحے اس سناٹے میں ایک خیال تیرا..کہ انہی انگلیوں نے وہ شعر لکھا تھا جسے اس نے اپنے آخری خط میں Quote کر کے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا..انہی انگلیوں نے..جس شعر نے اسے زندگی بھر کے لیے مجرم بنا دیا تھا..وہ انہی بے جان انگلیوں نے لکھا تھا جب ان میں جان تھی..زندگی کی حدت دمکتی تھی..

یہ لمحہ بھی اس کی مانند سناٹے میں آ کر ٹھہر گیا..جامد ہو گیا..پتھر ہو گیا..ایک مجسمے میں بدل گیا..

ایک ایسا مجسمہ جسے آج تک کسی سنگ تراش نے تراشا نہ تھا..جس کی کوئی مثال نہ تھی..

سوائے ایک مثال کے..

روم کے کلیسائے سینٹ پیٹر کے گنبد تلے البتہ ایک مجسمہ تھا..

بی بی مریم سر جھکائے..سر کو چادر سے ڈھکے..سنگ مرمر کی اس سفید چادر سے ڈھکے جسے مائیکل اینجلو نے تراشا تھا..اپنے بیٹے عیسیٰ کی لاش کو بازوؤں میں تھامے..ڈھلکتی ہوئی..بازو ڈھلکے ہوئے..ٹانگیں مردہ اور ان کی رگیں ڈھیلی..بی بی مریم بیٹھی ہیں..اپنے بیٹے کی لاش کو اپنے

زانوؤں پر رکھے، سر جھکائے..ان کے ہاتھ زندگی میں ہیں اور بیٹے کی انگلیوں میں جان نہیں ہے..
بس یہی ایک مثال تھی..

یہ مجسمہ اس کے سامنے ہمیشہ آویزاں رہا..شاعرہ کی لاش اٹھائے ہوئے اس کی مردہ انگلیوں کو گرفت میں لیے ہوئے..ہر چوک میں..ہر شاہراہ پر..اس کے بستر کی سائیڈ ٹیبل پر..ٹیبل لیمپ کے عین نیچے یہی مجسمہ سجا رہا..کفن میں پوشیدہ انگلیوں پر اس کی زندہ گرفت..پتھر ہو گئے..

اس لمحے جب وہ مجسمہ تخلیق ہونے کو تھا تو اس نے شکایت تو کی تھی کہ اے مردہ انگلیوں، تم نے وہ شعر کیوں لکھا جس نے مجھے بے توقیر کیا..

تو اس شکایت کے جواب میں ان مردہ انگلیوں نے کچھ نہ کچھ تو لکھا ہوگا..

کیڑے مکوڑوں کا رزق بننے سے پہلے..

مردہ انگلیاں اگر لکھ سکتیں تو کیا لکھتیں..

شاید انہوں نے اس مردہ حالت میں بھی ایک شعر اُس کے لیے لکھا ہو..

اسے لفافے میں بند کر کے اسے پوسٹ کیا ہو..

اور ڈاکیا اسی مردہ شاعرہ کا خط لیے اُس کی جانب آ رہا ہو..

کیا پتہ...

کون؟

کون...کوئی ایک فرد بھی ہوسکتا ہے..ایک انسان..

کون..ایک بُوٹا ہوسکتا ہے..ایک کونپل ہوسکتی ہے..چندروزہ حیات کی پھڑ پھڑاہٹ کی حامل ایک تتلی..ایک پتنگا..برسات میں زمین سے نکلنے والی ایک بیر بہوٹی بھی ہوسکتی ہے..

کون..ایک خیال بھی تو ہوسکتا ہے جو ماورا ہوتا ہے کہ کون زمان ومکاں کے کس لمحے میں وہ حیات کررہا ہے اس کا فیصلہ نہیں ہوسکا..

ایک بُوٹا..کسی ڈائناسورس کے بھاری دھمک والے پاؤں تلے روندا جانے والا بُوٹا...یا پھر کسی کوہ نورد کے بھاری بوٹوں سے کچلا جانے والا وہ بُوٹا جو 2003ء میں ناگا پربت کے راستے میں رُوپل وادی میں سر اٹھاتا ہے..اس بُوٹے کی فہم میں یہ نہیں ڈالا گیا کہ وہ زمان ومکاں کے کون سے لمحے میں زندہ ہے اور پھر اگلے لمحے میں کچلا گیا ہے...

چندروزہ حیات کی تتلی جو ایک اٹھارہ برس کے فرعون کے مقبرے میں رہ گئی تھی جب کہ اسے دفن کرنے والے اس کے زیرِ زمین مقبرے کو پتھر کی سِلوں سے بند کر کے چلے گئے تھے تو وہ اُس کے تابوت کے سنہری نقاب پر بیٹھ کر یہ سوچتی تھی کہ میں کہاں ہوں...یہ تتلی اس تتلی سے مختلف نہیں ہوتی جو 2002ء میں تقریباً تین ہزار برس بعد سنولیک کی برفوں میں گر کر حنوط ہو جاتی ہے۔

اسے جو مقبرے میں رہ گئی تھی اسے جو کچلی گئی تھی اور اسے جو برف میں مدفون ہوگئی تھی، اُن تینوں کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کون سے زمانے میں پھڑ پھڑاتی تھیں..

اور اسی طور ایک بُوٹے ایک تتلی کی مانند انسان بھی اگرچہ کبھی ڈائناسورس کو شکار کرنے کی سعی کرتا تھا اور کبھی چاند پر قدم رکھتا تھا لیکن وہ بھی نہیں جانتا کہ اُن زمانوں میں کون سا زمانہ ہے..جس میں وہ سانس لیتا ہے زندگی کرتا ہے۔

وہ... انسان.. محض ورغلایا جاتا ہے... تاریخ اور عقیدے کے کٹڑ بے لچک اور متعصب حوالوں سے کہ تم فلاں عہد میں سانس لے رہے ہو.. ورنہ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کوئی علم نہیں ہوتا..

وہ ایک بُوٹے ایک تتلی کی مانند اپنا فرض پورا کر رہا ہوتا ہے۔ زندہ رہنے اور اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کے لیے... تاریخ اور عقیدہ اسے ورغلاتا ہے..

معاشرہ اور اس معاشرے کی سازش سے چلنے والی تمام گھڑیاں اسے کسی ایک لمحے میں قید کر کے اسے یقین دلا دیتی ہیں کہ تم محض اس زمان و مکاں کے باسی ہو..

جب کہ ایسا ہوتا نہیں..

ایک بُوٹے.. ایک تتلی اور ایک انسان کی مانند ڈاکیا محمد علی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمان و مکان کے کسی ایک لمحے میں.. وقت کی کسی ایک طے شدہ کترن میں.. اپنے گھوڑے کی بادامی رنگت کی لشکتی پشت تھپکتا میری جانب نہیں آ رہا.. بلکہ وہ ہمیشہ سے جب دھند پانیوں پر تیرتی تھی اور ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی اور روشنی کو ہو جانے کا اذن نہیں ملا تھا اور جسے ازل بھی کہتے ہیں تب سے میری جانب چلا آ رہا تھا.. اور وہ جو میری طرح بھولے بھٹکے اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں' متلاشی ہوتے ہیں ہمیشہ منتظر ہوتے ہیں ہمیشہ اس سے پوچھتے ہیں کہ میرے نام کا کوئی خط تو نہیں؟..

اور اگر اس کے نام کا کوئی خط اس کے چرمی تھیلے میں ہوتا ہے تو وہ منتظر وہ متلاشی برگزیدہ ہو جاتا ہے..

محمد علی ڈاکیا چونکہ ہمیشہ سے جسے ازل کہتے ہیں کسی نہ کسی کی جانب اپنے گھوڑے کی پشت کو تھپکتا چلا آ رہا ہے' اس لیے وہ کبھی تو ایک جلتی ہوئی جھاڑی کی قربت میں نظر آتا ہے اور اس کا گھوڑا کوہ طور کے پتھروں پر بے آواز چلتا آتا ہے.. کبھی وہ ایک صلیب کے سامنے کھڑا دکھائی دیتا ہے اور اس خط کو دیکھتا ہے جو اس کے نام آیا تھا جس نے دوسروں کے گناہ اپنے سر لے لیے تھے.. ڈاکیا کسی اندھے کنویں میں جھانک کر یوسف کو بھی تلاش کرتا ہے.. اس نے عین وقت پر پہنچ کر اسماعیل کی گردن پر رکھی چھری کو ہٹایا تھا.. کبھی وہ غار حرا کے آس پاس منڈلاتا ہے...

وہ کسی بھی زمان و مکاں کے کسی ایک لمحے میں قید نہیں.. اگرچہ وہ بھی نہیں جانتا اور یہی قیاس کرتا ہے کہ سامنے سے جو کوہ نور چلا آ رہا ہے کیا اس کے نام کا بھی کوئی خط میرے پاس ہے یا نہیں...

اسی ڈاکیے نے شاہ گوری کے نیلو نیل بدن پر خطوں کے پھاہے بھی رکھے تھے.. جہاں جہاں چمڑے کی بیلٹ اس کے بدن میں کھب کر اپنے نشان چھوڑ گئی تھی' وہاں وہاں اس نے ایک ایک خط رکھا تھا..

ایک خط شکاری کی لبلبی کو دبانے والی انگلی پر چپکا دیا تھا تا کہ نشانہ خطا ہو جائے..

عجیب ڈاکیا تھا جو کولرج کے افیون کے گولے کو ایک خط میں لپیٹتا تھا.. غالب کے روزِ ابر و اور شب ماہتاب کے شراب میں جھلکتا تھا.. قراۃ العین طاہرہ کو تلاش کرنے کے لیے کنویں میں جھانکتا تھا.. ابونواس کے جام میں گھلتا تھا.. کبھی ایک ویران ریلوے سٹیشن کے بنچ پر ایک خط رکھتا تھا' جس پر ٹالسٹائی نے آ کر مر جانا تھا.. کالی داس کی شکنتلا کے قلانچیں بھرتے ہوئے ایک ہرن کے آگے اپنا گھوڑا کھڑا کر کے اسے روکتا تھا اور ایک خط اس کے نام کا اس کے آگے رکھتا تھا...

کہیں یہ ڈاکیا وہ تو نہیں جس کی ہر ذی روح کو ازل سے تلاش ہے کہ وہ آئے اور اس جہان سے آگے ایک اور حیات کی نوید دے...

وہ خوب آگاہ تھا کہ کس کے نام کون سا خط ہے ...اگر ہے تو...اور وہ انہیں گڈمڈ نہیں کرتا تھا.. جانتا اس لیے تھا کہ یہ سب خط اسے اس کے پوسٹ ماسٹر نے دیئے تھے پہنچانے کے لیے...اور وہ تو صرف ڈیوٹی دے رہا تھا... جسے جو خط جس لمحے.. جہاں پہنچانا تھا... پہنچا رہا تھا...

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ صرف میں نہ تھا جو وادیٔ شگر سے پرے...خوبانیوں کے سورجوں سے لدے پیڑ اور حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے کہیں آگے ڈاکیے کو اپنی جانب آتے دیکھتا تھا..

صرف میں نہ تھا..

آپ سب بھی تھے..

سبھی جو منتظر اور متلاشی ہوتے ہیں..وہ سب تھے...

میں تنہا نہ تھا..

آپ سب بھی تھے...

اور جب میں صیغہ واحد متکلم استعمال کر رہا ہوں تو اسے جمع کر لیجیے...کہ یہ صرف میں

نہیں آپ سب بھی ہیں...

ہم سا تجھے متلاشی اور منتظر ہیں..

اسی طور وہ جو سامنے سے چلا آ رہا ہے' وہ بھی محض ایک ڈاکیا نہیں ہے.. کچھ اور ہے... کیا ہے؟.. اس کی تو تلاش ہے کہ کیا ہے..

نہ وہ کسی ایک لمحے میں.. کسی بھی زمان و مکان میں.. قید تھا اور نہ میں..

اور ہم دونوں ازل سے ایک دوسرے کو ڈھونڈتے آئے تھے..

اس کے پاس بہرصورت میرے نام کا ایک خط ہونا تھا.. اگر نہ ہوتا تو وہ سامنے سے کیوں آ رہا ہوتا.. اسی لمحے.. اسی مقام پر وہ کیوں دکھائی دیتا... وہ ڈاکیا صرف اسی صورت ہو سکتا تھا... اس کے ڈاکیا ہونے کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ اس کے چرمی بیگ میں میرے نام کا ایک خط تھا...

اگر اس کے چرمی بیگ میں میرے نام کا کوئی خط نہ تھا... تو اس کے سامنے سے آنے کا کوئی جواز نہ تھا... اس مقام.. اس لمحے یہاں نمودار ہونے کا کوئی جواز نہ تھا.. اگر خط نہ تھا اور پھر بھی وہ سامنے سے آ رہا تھا تو وہ ڈاکیا نہ تھا' ایک بہروپیہ تھا..

اس کے بہروپ نے ہی تو تمام تر شک و شبہات کو جنم دیا تھا...

بہروپ کا ہی سارا فساد تھا..

میں نا ہیں.. سب توں اور انا الحق کا فساد..

اگر میں نہیں تو وہ ہے... وہ ہے تو میں ہوں..

اسی لیے وہ اپنے ہونے کا انحصار مجھ پر کرتا ہے.. میں.. جو انسان ہوں.. چاہوں تو وہ ہو.. نہ چاہوں.. مُنکر ہو جاؤں تو وہ نہیں ہے..

وہ بہروپ نہ بھرتا تو کسی کو کوئی شک شبہ نہ ہوتا۔ ہر کوئی چین اور آنند کی نیند سوتا.. کوئی بھی تشکیک کا شکار نہ ہوتا..

لیکن میں کہاں سے کہاں چلا گیا ہوں.. میں یقیناً بھٹک گیا ہوں.. راہِ راست سے بھٹک کر کہیں اور نکل گیا ہوں..

میں تو محض ایک عام سے.. معمولی ڈاکیے کو بیان کر رہا تھا.. اس قسم کا ڈاکیا جس کے وجود سے بھی ہم واقف نہیں ہوتے.. وہ باقاعدگی سے آ کر ڈاک پھینک کر چلا جاتا ہے.. اور کبھی دو چار

ہفتوں کے بعد اگر کوئی رجسٹری خط آ جائے تو دستخط کروا کے چلا جاتا ہے..عید بقرعید.. پر عیدی لے کر چلا جاتا ہے۔

محض ایک معمولی سا ڈاکیا..بس اسی نوعیت کا ایک ڈاکیا لمحۂ موجود میں میری جانب چلا آتا تھا..

ویسے میں راہِ راست سے بھٹک کر اگر کہیں اور نکل گیا ہوں تو مجھے بھٹکانے اور راہ راست سے ہٹانے والا بھی تو وہی ہے کہ سب کچھ اس نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے...اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا..یہ پتہ جو انسان ہے اگر ہلتا ہے بھٹکتا ہے تو اسے کون ہلاتا ہے' بھٹکاتا ہے..قضا اور قدر کا مسئلہ تو اسی نے کھڑا کیا ہے ورنہ انسان تو سر جھکا کر بے شک بے شک کہنے والوں میں سے ہے..کس نے قراۃ العین طاہرہ کو ورغلایا...راہ راست سے بھٹکایا' طے شدہ شریعت سے انحراف کرنے پر مجبور کیا...اس نے نہیں تو کس نے؟ طاہرہ کی کوبہ کو، کوچہ بہ کوچہ درماندگی اور آوارگی کا کون ذمہ دار ہے..طاہرہ...جس کے بس میں کچھ نہ تھا یا وہ...جس کے بس میں بقول اس کے سب کچھ ہے...اس کے شریعت سے انحراف اور محبت کی ایک نئی شریعت کے اعلان کو کس کی پشت پناہی حاصل تھی..اس کی نہیں تو کس کی..؟ وہ خود تو ایک گوشت پوست کے ایک عارضی وجود کے سوا کیا تھی جو بالآخر ہر انسان کی مانند قبر کے کیڑوں کی خوراک بنی..اس کنویں کی قبر کے کیڑوں کی خوراک جس میں ایک ریشمی رومال سے اس کا گلا گھونٹ کر پھینک دیا گیا تھا اور کنویں کو مٹی سے پُر کر دیا گیا تھا...

ہاں واقعی...میں کچھ زیادہ ہی بھٹک گیا ہوں..متعینہ راہِ راست سے کچھ زیادہ ہی ہٹ گیا ہوں..

میں نے اسے موت کے سیاہ پوش کی صورت میں وادیٔ سوختر آباد میں پامیر کے سائے میں دیکھا تھا لیکن تب یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ محمد علی ڈاکیے کا ہی ایک بہروپ ہے جو میرا پیچھا کر رہا ہے...یہ اس کی موجودگی تھی جو ہر منظر ہر چہرے کو حسن اور بے مثالی کی شعاعیں عطا کرتی تھی جن کی زد میں آ جانے والا شخص...فاتر العقل ہو کر انہیں پوجنے لگتا ہے کہ اس سیاہ پوش کی موجودگی اسے احساس دلاتی ہے کہ یہ منظر ہمیشہ رہے گا اور تم نہیں رہو گے اور یہ چہرہ بھی فنا ہو جائے گا اس لیے اسے جی بھر کے دیکھ لو...

اگرچہ ایک بوٹا' ایک تتلی اور ایک انسان یہ نہیں جانتے کہ وہ زمان و مکاں کے کون سے

لمحے میں سانس لے رہے ہیں... مجبور اور بے بس ہیں... کوئی ایک ڈائنا سورس کے پاؤں تلے آ جانے پر... کوئی برف کی سلطنت میں حنوط ہو جانے پر.. اور کوئی لکھی گئی تقدیر کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے.. اور اس کے باوجود یہ سب.. ایک بوٹا' ایک تتلی' ایک انسان گواہی دے سکتے ہیں کہ محمد علی ڈاکیے کا وجود ہے..

یہ نہ ہوں تو محمد علی ڈاکیے کا بھی کوئی وجود نہ ہو..

جولاہے کو ابھی ابھی ایک بے وقوفی کا احساس ہوا ہے..

وہ بے شک بے وقوف ہے لیکن کوئی عام جولاہا نہیں' اس لیے اسے اس کا احساس ہوا ہے..

اس بیانیے کو پڑھتے ہوئے اس پر کھلا ہے کہ شاید پڑھنے والے کے دل میں ایک غلط فہمی جنم لے چکی ہو..

کہ یہ صرف جولاہے کی سرگزشت ہے..

کہ وادیٔ شگر سے پرے خوبانیوں سے حامل اور بوجھل ہوتے درخت کے آگے اس پہاڑی نالے کے پار سے آنے والے ڈاکیے کو صرف اس نے دیکھا ہے..اس کے بدخشانی گھوڑے کی لشکتی جلد کو صرف اس نے دیکھا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔

وہ سب جو اس جہانِ رنگ و بو میں لمحۂ موجود میں سانس لے رہے ہیں' ان سب نے اسے دیکھا ہے..اپنی جانب بڑھتے ہوئے..

جولاہے کی وہاں اس وقت کی کترن میں موجودگی محض علامتی ہے..اس کی وہاں موجودگی ان سب کی موجودگی ہے جو اس جہانِ رنگ و بو میں سانس لے رہے ہیں..

جولاہا ایک نمائندہ ہے..

ہر اُس شخص کا جو شعور کی سرحدوں کو پار کر کے..شعور کی وہ سرحدیں جنہیں معاشرہ اپنی بنیاد پرستی کی تلوار سے ایک گھاؤ کی مانند کھینچ دیتا ہے..اور وہ شخص جب دوسروں سے الگ اور مختلف ہو جاتا ہے..اخلاقیات اور محسوسات کے پیمانے اس کے سب سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہر اس شخص کے سامنے سے ڈاکیا محمد علی اپنا چرمی تھیلا گھوڑے کی لشکتی جلد پر جھلاتا چلا آتا ہے۔

ہر اس شخص کے لیے اس کے تھیلے میں کوئی نہ کوئی سندیسہ ضرور ہوتا ہے' چنانچہ جو کچھ یہ جولاہا بیان کر رہا ہے' وہ آپ بیتی ہرگز نہیں.. جگ بیتی ہے اور وہ محض ایک علامت ہے..ایک نمائندہ ہے.. یوں بھی حیات ایک کاک ٹیل کی مانند ہے جس کا ایک گھونٹ بھرنے سے قطعی طور پر اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں کون کون سی شرابیں شامل ہیں..

جولاہے کو ابھی ابھی اس بے وقوفی کا احساس ہوا ہے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ صرف اور صرف اس کی زندگی کا بیان ہے..

جو کچھ آپ پر..اس لمحۂ موجود میں سانس لینے والے ہر شخص پر بیتا ہے وہی بیان کیا جا رہا ہے۔

جولاہا فقط ایک نمائندہ ہے۔

چرمی بیگ میں کسی کے نام کا بھی ایک خط ہوسکتا ہے..

لمحۂ موجود میں سانس لینے والے کسی بھی ایک شخص کے نام..

جولاہا تو محض ایک نمائندہ ہے..

ہر شخص اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی جرم کرتا ہے..

یہ جرم جان بوجھ کر منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں کیا جاتا..ہو جاتا ہے...ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ایک جرم تھا' جو ہو گیا ہے..

کوئی اپنی من پسند کتاب ایک بک شاپ کے مالک کی نظروں سے اوجھل ہو کر اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس کر باہر آ جاتا ہے..گھر پہنچنے پر پچھتاتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا..میں اسے خرید سکتا تھا تو چوری کر کے کیوں لے آیا..پچھتاوے کی تاب نہ لا کر اسے واپس جا کر اس شیلف میں رکھ دینا چاہتا ہے اور بعض اوقات ایسا کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے اور دفاع میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک ہے میں نے اسے چوری کیا تھا' لیکن میں تو اب اسے واپس رکھ رہا تھا اور دیگر گاہکوں کی موجودگی میں بے عزت کر کے بک شاپ سے باہر دھکیل دیا جاتا ہے..اور اکثر اوقات احساس جرم کی شدت کے باوجود اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس کتاب کو واپس رکھ آئے اور وہ ایک کتاب زندگی بھر اسے چین نہیں لینے دیتی' کچوکے لگاتی رہتی ہے..

اس کا جرم قدرے سنگین نوعیت کا ہے..

اس میں ساڑھے پانچ انچ لمبا ایک نشان ہے جو ایک کومل پیٹ پر کھنچا ہوا ہے..

شمس الدین تجربہ کار.. بہت تجربہ کار تھا..

وہ پاکستان سے گیا تو بہت کچا تھا.. یورپ کے مختلف ملکوں کی گوریوں نے اسے اپنی بھٹیوں کی آگ میں ڈال کر پکایا اور پکا کر دیا..

اور وہ ایک عام پاکستانی مڈل کلاس نوجوان کی مانند سب کچھ جانتا تو تھا لیکن کسی بھی عملی تجربے میں سے گزرنے کے بغیر بس جانتا تھا... جیسے ''تیراکی سیکھئے'' کی گائیڈ بک پڑھ کر آپ یہ تو جان جاتے ہیں کہ پانی میں اترنے کے بعد سطح پر رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں کیسے مارتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جان سکتے کہ جب سچ مچ پانی میں اترا جائے تو پھر کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے..

لیکن ''وہ'' یعنی شمس الدین متعدد بار پانی میں اتر چکا تھا بلکہ پانی کا کیڑا تھا اور خوب جانتا تھا کہ ایک چھوٹی سی آہستہ روندی میں.. یا ایک تند اور خودسر پہاڑی نالے میں جو اپنے آپ میں قدم رکھنے نہیں دیتا یا ایک جوہڑ میں داخل ہو کر کیسے اس میں نہایا جا سکتا ہے..

وہ اکثر بھیگا رہتا تھا..

''ڈونٹ ٹیل می ذیٹ'' اس کے شمس الدین کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی..

اور ہاں شمس الدین اس کے بچپن کا یار تھا۔ یورپ میں منافع بخش اطمینان سے زندگی گزارتا تھا اور ان دنوں اپنی ماں کی ناگہانی موت پر بہن بھائیوں کے سامنے صرف سرخرو ہونے کے لیے چند روز کے لیے پاکستان میں تھا تو اس کے چہرے پر بے یقینی تھی، جب اس نے کہا ''ڈونٹ ٹیل می ذیٹ'' یعنی تم ابھی تک ورجن ہو... تمہارا مطلب ہے کہ تم ابھی تک.. یو ڈونٹ نو وہاٹ اے وومین از..''

''نہیں..'' اس نے خجل ہو کر انکار میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں.. کیوں نہیں؟''

''اپنے ملک میں گوریاں نہیں ہوتیں شمس الدین۔''

''ہوتی ہیں جان.. بلکہ ان سے بھی کہیں آسان ہوتی ہیں.. یورپ میں تو محبت کا ڈھونگ رچانا پڑتا ہے۔ کچھ ادب آداب ہوتے ہیں.. اور وہ مرضی کی مالک ہوتی ہیں.. مرضی نہ ہو تو آئس برگ سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہو جاتی ہیں.. منت سماجت کرنی پڑتی ہے.. ماحول تخلیق کرنا پڑتا

ہے..اور یہاں محض ایک لمس کافی ہوتا ہے اور پگھلاؤ شروع ہو جاتا ہے....بہت آسانی ہے..آؤ میرے ساتھ چلو..تمہاری کنوارپن کی مہر توڑتے ہیں..''

''میں اس بازار میں نہیں جاؤں گا..''

''نہ..وہاں نہیں۔''

''تو پھر کہاں؟''

''رہتے تم ہو پاکستان میں اور بتانا مجھے پڑتا ہے کہ اب ادھر ہر بازار..وہ بازار ہے..بس دیکھنے والے کی نظر چاہیے..آؤ..''

گلبرگ کا مین بلیوارڈ..ڈیفنس کی وہ سڑک جس کے آس پاس غیر ملکی خوراک گھر ہیں..

رات کو نہیں..

دن کے وقت..کڑکتی دھوپ میں..پچھلے پہر..

شمس الدین کی ہونڈا باہر کے موسموں سے بے خبر ٹھنڈک میں ہولے ہولے کروز کر رہی تھی..

''یار..یہاں کیا ہو سکتا ہے؟''

''یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اور..ہوتا ہے..''

''میں اکثر ان علاقوں میں سے گزرتا ہوں..کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

''تم موٹر سائیکل پر گزرتے ہو۔''

''کچھ ہونے کے لیے ایک ہونڈا کار بنیادی شرط ہے؟''

''ہاں..ایک نئی کار اور..دیکھنے والی نظر..''

''جو میرے پاس نہیں..''

''نہیں..میں نے پچھلے دو تین ہفتوں میں اس شہر کی اس رگ کو جان لیا ہے' جس پر صرف ہاتھ رکھنے کی دیر ہے اور وہ دھک دھک کرتی پگھلنے لگتی ہے...میں اماں کے چالیسویں تک یونہی سوکھا پڑا نہیں رہ سکتا' مجھے گیلاہٹ چاہیے تھی..اور وہ میں نے تلاش کر لی..اور اتنی آسان گیلاہٹ جو محض چھو لینے سے بہنے لگتی ہے..''

اسے وہ بہت برا لگا..

وہ اس کے دیس کی لڑکیوں کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اسے بہت برا لگا..

اسے یقین تھا کہ وہ ایسی نہیں ہیں اور وہ انتظار کرنے لگا کہ شمس الدین اس مشن میں ناکام ہو اور پھر وہ اسے ذلیل کرے لیکن یہ موقع اس کے نصیب میں نہ تھا..

مین بلیوارڈ کے بڑے پانی کی دھاریں بوچھاڑیں اگلتے فوآرے کے قریب جو بھی سٹاپ ہے' اس کے عقب میں درختوں کی اوٹ میں بظاہر چہل قدمی کرتیں دو لڑکیاں تھیں..وہ عام سے لباس میں عام سی نارمل قسم کی لڑکیاں تھیں..

اس نے نہیں..شمس الدین کی نظر نے نوٹ کیا کہ دیکھنے والی نظر وہ رکھتا تھا کہ ان میں سے ایک کبھی کبھار مڑ کر ادھر دیکھتی ہے جدھر مین بلیوارڈ کی ٹریفک رواں تھی..

شمس الدین کی ہونڈا ان کی چلنے کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگی..

انہوں نے نظریں اٹھا کر قطعی طور پر یہ نہ دیکھا کہ ان کے برابر میں ایک کار انہی کی رفتار سے دھیرے دھیرے چلتی ہے اور اس میں دو نوجوان ہیں جن میں سے ایک کا چہرہ پُراعتماد.. کسی حد تک پُرتکبر..ہے اور دوسرا اپنی نشست میں دھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے..

''ہیلو..''

وہ بدستور چلتی رہیں۔

''ہیلو..'' ظاہر ہے یہ شمس الدین تھا..

آپس میں کھسر پھسر کرتی وہ چلتی گئیں..

''دیکھیں..اگر آپ نے کہیں ڈراپ ہونا ہے تو ہم آپ کو ڈراپ کر سکتے ہیں..''

ان میں سے ایک نے ایک مختصر پل میں ان کی جانب دیکھا..

شمس الدین نے بریک پر پاؤں رکھ دیا''پلیز آ جایئے..ہم آپ کو ڈراپ کر دیں گے..''

وہ اپنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا نروس تھا..اسے معلوم تھا کہ شمس الدین کی اس پیشکش پر یا تو وہ اسے گالیوں سے نوازیں گی یا زیرلب بڑبڑاتی چلی جائیں گی..لیکن وہ بالکل سناٹے میں آ گیا جب وہ دونوں کچھ بھی کہے بغیر شمس الدین کے دھکیلے ہوئے دروازے میں سے داخل ہو کر کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں..

''ہم دونوں میکڈونلڈ جا رہے تھے' ایک آئس کریم کے لیے..تو کیا آپ..''

''نہیں..''

''پلیز..''

''آپ ہمیں ڈراپ کر دیں..''

''صرف پانچ منٹ لگیں گے آئس کریم کے لیے..پلیز..''

''نہیں..''

''ہم آپ کو اس کے فوراً بعد آپ کے ہوسٹل اتار دیں گے..''

''آپ کیسے جانتے ہیں کہ ہم ہوسٹلائٹ ہیں..'' وہ ہنسنے لگیں..

''میں نے یونہی اندازہ لگایا تھا..پلیز..صرف ایک آئس کریم ہمارے ساتھ شیئر کریں..پلیز..''

''اوکے..''

اس ایڈونچر کے کچھ روز بعد شمس الدین نے اسے بتایا تھا کہ یہ تمہارے شہر کے تازہ ترین رواج ہیں اور تم نہیں جانتے..یہ ایک روٹین بن چکی ہے۔اس میں کوئی خدشہ نہیں' کوئی خطرہ نہیں...ہوسٹلوں میں رہنے والی کچھ لڑکیاں..ورکنگ وومن ہوسٹلز یا یونیورسٹی کالج کے ہوسٹلز میں رہنے والی کچھ لڑکیاں گیم ہوتی ہیں..کیبل اور وی سی آر کی ڈسی ہوئی..بلیو فلموں کو دیکھ دیکھ کر نڈھال..ایک آدھ تجربے والی ساتھی کی پُرجوش باتیں سُن سُن کر..یہ گیم ہو جاتی ہیں..فاسٹ فوڈ جوائنٹس کی شائق..یونہی پچھلے پہر جوڑوں میں چہل قدمی کرتی ہیں..اپنا نام نہیں بتاتیں..پتہ فون نمبر روپوش رکھتی ہیں اور جسٹ فار فن کے ضمن میں آپ کے ساتھ ایک برگر یا آئس کریم میں شریک ہو کر چلی جاتی ہیں..جسٹ فار فن..وہ اس حد سے آگے جانے کی نہ خواہش رکھتی ہیں..اور نہ ان میں سکت ہوتی ہے..جب تک کہ کوئی شمس الدین ایسا معصوم دکھائی دیتا اندر سے گھاگ نوجوان ان کی ناتجربہ کاری میں اپنا تجربہ داخل نہ کر دے..

اس کے حصے میں جو لڑکی آئی تھی..اور شمس الدین نے ان کے برابر میں کار روکنے سے پیشتر ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ جو قدرے فربہ اپنی قمیص میں پھنسی ہوئی ہے' وہ میری ہے..اور جو ذرا دبلی پتلی اور گھبرائی ہوئی ہے وہ تمہاری ہے..

تو دبلی پتلی اور گھبرائی ہوئی اس کے حصے میں آئی تھی اور وہ اس سے کہیں بڑھ کر گھبرایا ہوا تھا..

''دیکھو میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں..'' شمس الدین نے اس ایڈونچر پر نکلنے سے پیشتر اسے لیکچر دیا تھا ''یورپی لڑکی جونہی اپنی پریم سے باہر قدم رکھتی ہے' وہ اپنی دوشیزگی کے